بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہ ہمارا خواب تھا — یہ خواب کی تعبیر ہے

برادرانِ گرامی قدر! السلام علیکم

ملّتِ اسلامیہ کے ایک عظیم مفکّر نے، جس نے اپنے آپ کو بجا طور پر "دیدۂ بینائے قوم" کہا تھا، ایک نہایت حسین خواب دیکھا، جسے اس نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر ان الفاظ میں اپنی قوم ہی نہیں، بلکہ ساری دنیا کے سامنے پیش کر دیا کہ:-

> ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں، یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا...... اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو — (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے...... اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔
>
> (خطبۂ صدارت علامہ اقبالؒ۔ مسلم لیگ سیشن ۱۹۳۰ء)

اس اعلان نے فضا میں تھرتھری پیدا کر دی۔ اُس وقت تک اسلام کے متعلق عام طور پر یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ بھی باقی مذاہب کی طرح ایک مذہب ہے۔ اور مذہب کے متعلق تصور یہ تھا کہ

وہ خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ روحانی تعلق کا نام ہے۔ امورِ مملکت سے اِسے کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام کے متعلق اس غلط فہمی میں اپنے اور بیگانے، قریب قریب، سبھی مبتلا تھے۔ انہوں نے پہلی بار سنا کہ اسلام اسی صورت میں ایک زندہ حقیقت بن سکتا ہے جب اس کے پیرؤوں کی اپنی آزاد مملکت ہو، جس میں وہ اِس قابل ہوں کہ آزادانہ اسلام کی ابدی اقدار پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اس وقت غیر منقسم ہندوستان میں آزادی کی تحریک جاری تھی جس سے مراد یہ تھی کہ تمام اقتدار انگریزوں کے ہاتھ سے چھین کر پورے ہندوستان میں ایک آزاد مملکت قائم کر لی جائے۔ اور اس مملکت میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو —— یعنی اُسی قسم کے اسلام کی آزادی، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ آزادی کا یہ تصور عوام ہی کا نہیں تھا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے اکابرین، حتیٰ کہ ان کے علمائے کرام تک اِسی کے حامی تھے اور اس آزادی کے حصول کی کوششوں کو جہادِ عظیم کہہ کر پکارتے تھے۔ بنا بریں، مسلمانوں کے لئے آزادی کا جو تصور اقبالؒ نے پیش کیا، اس کی، اور تو اور، ان علماء کی طرف سے بھی سخت مخالفت ہوئی اور انہی کے ساتھ علامہ اقبالؒ کو سب سے بڑی جنگ کرنی پڑی۔ اِس سلسلہ میں اول کا جو معرکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ ہوا، وہ تاریخ کے صفحات میں ایک ابدی حقیقت کے طور پر منضبط ہے۔ مولانا مدنیؒ کا مسلک یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے بعد وہاں مغربی اندازِ جمہوریت کی حکومت قائم کر دی جائے، جس میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو۔ علامہ اقبالؒ کا مؤقف یہ تھا کہ آزادی کا یہ تصور ہندو کا تو ہو سکتا ہے، مسلمان کا نہیں جہاں تک ملک کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کا سوال ہے، اس میں مسلمان برابر کے شریک ہیں، لیکن اِن کے نزدیک یہ آزادی نہیں بلکہ آزادی کے حصول کا ذریعہ یا اُس کی منزلِ اول ہے۔ اِن کے تصورِ آزادی کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب انہیں اس امر کی آزادی

مسلمانوں کی آزادی

ہو کہ وہ اپنے ہاں اسلامی حکومت قائم کر سکیں —— اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب بلا شرکتِ غیرے ان کی اپنی جداگانہ مملکت ہو۔ چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے چند ہی ماہ پہلے (۱۹۳۸ء میں) مولانا مدنی مرحوم کے اعتراض کے جواب میں فرمایا تھا۔

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اوّلین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا: چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ

چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ویسا ہی رہے، یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے، میں ایسی آزادی کی راہ میں، لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

(علامہ اقبالؒ کا بیان موسوم بہ "معرکۂ دین و وطن")

نیشنلسٹ علماء کا یہ نظریہ بھی تھا کہ ایک وطن کی حدود کے اندر بسنے والے تمام لوگ بلاتفریق مذہب و ملت ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ قوم ہے جس کی مشترکہ حکومت اس ملک میں قائم ہونی ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ہندوستانی قوم کے اجزاء ہیں اور اس لئے ان کی جداگانہ مملکت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا کہ قومیت کا یہ نظریہ بھی سراسر باطل اور قرآنی نظریۂ قومیت کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے قومیت کا معیار دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا۔ اس لئے کسی ملک کے اندر رہنے والے مسلمان محض اشتراکِ وطن کی بنا پر وہاں کی غیرمسلم آبادی سے مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ مسلمان ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اس بنا پر بھی اپنی الگ مملکت قائم کرنے کے حقدار ہیں۔ انہوں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جواب میں کہا کہ:-

اسلامی نظریۂ قومیت

اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابلِ قدر تھا تو رسول اللہؐ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قوموں کو، آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہؐ نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیتِ وطنی قائم رکھی...... محمدؐ (فداہ ابی و اُمّی) کی قوم آپؐ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی۔ لیکن جب محمدؐ کی اُمت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہؐ کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام کے، وہ سب اُمتِ مسلمہ یا ملّتِ محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے۔ اب ملک و نسب ان کا گرفتار ہو گیا...... حضورؐ رسالتمآب کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفارِ مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا

> سکتی ہے۔ لیکن حضورؐ (نعوذ باللہ) اگر یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی۔ نبیٔ آخرالزمان کی راہ نہ ہوتی۔
>
> (معرکۂ دین و وطن)

علامہ اقبالؒ نے اِس حقیقت کو بھی متعدد بار واضح کر دیا کہ ہم جو کہتے ہیں کہ اسلام میں قومیت کا مدار دین کا اشتراک ہے نہ کہ وطن کا، اور یہ کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اسی صورت میں بن سکتا ہے، جب اس کی اپنی آزاد مملکت ہو، تو کوئی شخص اس زعمِ باطل میں گرفتار نہ رہے کہ ہم اِن نظریات کو محض حصولِ اقتدار کے لئے بطورِ حربہ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے دین کی ابدی اور غیر متغیر حقیقتیں ہیں، جنہیں بدقسمتی سے مسلمانوں نے فراموش کر دیا تھا۔ میں اُنہی کی یاددہانی کرا رہا ہوں۔ اسی بنا پر انہوں نے فرمایا:۔

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں بروقت مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ، اس راہ کا آخری مرحلہ اوّل تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے لاپرواہی۔
>
> (معرکۂ دین و وطن)

یہ تھا وہ خواب، جو اِس دیدہ ور نے دیکھا، اور اُسے دنیا کے سامنے ایسے واشگاف الفاظ میں پیش کیا۔ اقبالؒ اِس حقیقت سے بھی ناآشنا نہیں تھا کہ ایک مفکر صحیح نظریات پیش کر سکتا ہے۔ اُن نظریات کو عملی پیکروں میں ڈھالنا سیاسی مدبّرین کا کام ہوتا ہے۔ بنابریں انہیں کسی ایسے مدبّر کی تلاش تھی جو اِس عظیم مقصد کے حصول کا اہل بھی ہو اور انتہائی قابلِ اعتماد بھی۔ یہ بھی اقبالؒ کے کردار کی عظمت کا ثبوت ہے، ورنہ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ نام نہاد بڑے لوگ، یہ جانتے کے باوجود کہ وہ فلاں کام کے اہل نہیں، محض بڑا بننے کی ہوس میں اس کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کو جو عالمگیر شہرت حاصل تھی اور ملّتِ اسلامیہ کے دل میں بالخصوص ان کے لئے جو جذبۂ احترام موجزن تھا، اگر وہ بھی اِس قسم کی پوزیشن اختیار کر لیتے تو ان پر کوئی بھی معترض نہ ہوتا۔ لیکن ان کے جذبہ میں صداقت تھی، اس لئے انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور کسی ایسی شخصیت کو تلاش کرتے رہے جو اس کی اہل ہو۔ اور بالآخر ان کی یہ

جناحؒ کو ڈھونڈ نکالا

تلاش کامیاب ہوگئی۔ دنیائے سیاست کی فراست آج تک محوِ حیرت ہے کہ اس تلاش میں اُن کی نگاہ، جا کر ٹکی تو کس شخصیت پر——

اس شخصیت پر جس کے متعلق اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایمان کی بنیادوں پر جُداگانہ قومیت اور اسلام کے احیاء کے لئے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے نظریہ کو اپنا سکے گا، اور نہ صرف اپنا سکے گا، بلکہ اُسے کامیابی کی آخری منزل تک بھی پہنچا دے گا۔

بمبئی کے بیرسٹر مسٹر محمد علی جناحؒ بہت بڑے نیشنلسٹ تھے۔ عمر بھر ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے، اور جب اپنی کوششوں میں ناکام رہ گئے تو مایوسی کے عالم میں وطن کو چھوڑ کر سات سمندر پار انگلستان کے ایک گوشۂ تنہائی میں خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ علامہ اقبالؒ کی نگۂ متجسس جا کر اس شخصیت پر ٹکی۔ چنانچہ انھوں نے مسٹر جناحؒ سے رابطہ قائم کیا اور ایک عرصہ کی جد و جہد کے بعد ۲۱ر جون ۱۹۳۷ء کو انہیں وہ خط لکھا جو اُن کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ وہ تیر ٹھیک نشانہ پر جیٹھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ:-

> مَیں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف انسان ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ (میرے اِس اصرار و تکرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اِس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اِس طوفان میں، جو یہاں آنے والا ہے، اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت، ساحلِ مراد تک پہنچائیں گے۔
>
> (قائدِ اعظمؒ کی سوانحعمری۔ مؤلفہ ہیکٹر بلیتھو صفحہ ۱۱۵)

یہ تیر اقبالؒ کے قلب سے نکلا اور سیدھا جناحؒ کے دل میں تیر گیا۔ اقبالؒ نے پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ قرآنی نظریات کی یہ شمعِ فروزاں جناحؒ کے ہاتھ میں تھما دی جسے ملّت نے بجا طور پر "قائدِ اعظمؒ" کہہ کر پکارا۔ اقبالؒ کے بعد دین اور وطن کی یہ جنگ، قائدِ اعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے مخالفین کے درمیان ٹھن گئی ان میں انگریز، ہندو، کانگریسی مسلمان — سیاسی لیڈر اور نیشنلسٹ علماء سب شامل تھے۔ اور مسٹر گاندھی اس زمانہ میں اس متحدہ محاذ کا سربراہ تھا۔ مسٹر گاندھی نے قائدِ اعظمؒ کو لکھا کہ آپ دین کو قومیت کا معیار کیسے قرار دیتے ہیں اور مذہب کو سیاست میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں۔ اِس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے اُسے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو ایک خط لکھا، جس میں کہا کہ:-

> آج آپ اِس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوتِ محرکہ ہے جو آپ کو آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست؟ یا کہ اقتصادی اصلاح تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے۔) آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان سے واسطہ نہیں، مَیں اُسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے

اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اِس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں، محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریر جناحؒ۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۴۰-۱۳۹)

جہاں تک دو قومی نظریہ کا تعلق ہے، انہوں نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن (۱۹۴۱ء) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصُول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔۔۔۔۔۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم نے اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ مملکت کو قائم کرکے رہنا ہے۔ اس باب میں کسی کو، کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۲۸۰)

مسٹر گاندھی نے انہیں ایک خط میں لکھا کہ:۔

مَیں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ، جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں ـــ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اُسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے، خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔ (مکتوب مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء)

اسی قسم کے تھے وہ اعتراضات، جن کے پیشِ نظر قائدِاعظمؒ نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ:۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں ـــ یہ حقیقت ہے کہ دونوں "مذہب" نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے! ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملہ میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے ـــ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم

ہیں۔ دو ایسی قوموں کا ایک نظامِ حکومت میں جکڑ دینا، باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ (تقاریرِ جناح، جلد اوّل۔ صفحہ ۱۷۸-۱۷۷)

ہم شروع میں دیکھ چکے ہیں کہ جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصوّر پیش کیا تھا تو انہوں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ اس سے اتنا ہی مقصد نہیں کہ ہمیں ایک خطۂ زمین مل جائے جس میں ہم اپنی آزاد مملکت قائم کر لیں۔ اس سے حقیقی مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی مملکت وجود میں آ جائے، جس میں اسلام پھر سے زندہ حقیقت بن جائے، جس طرح وہ صدرِ اوّل میں بنا تھا۔ قائدِاعظم بھی جہاں غیروں کے ساتھ جنگیں لڑائی لڑتے تھے، خود اپنی قوم کے دل میں اس حقیقت کو راسخ کئے جاتے تھے کہ اس جدوجہد سے مقصود دنیا کی اور قوموں کی طرح ایک آزاد مملکت قائم کرنا نہیں۔ بلکہ اس سے مقصود اسلام کا احیاء ہے، جو اپنی مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثلاً انہوں نے ۱۰ر مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین، علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کے لئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے، بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۶۷)

ان کے نزدیک اس مقصد اور نصب العین کی کس قدر اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انہوں نے ۲۳ر مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا:-

ہماری حفاظت، نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا، نہ اسلام کا نام و نشان۔ (تقاریرِ جناح۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۵)

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ ان کے نزدیک مملکتِ پاکستان کا مقصود کیا تھا اور اس کی اہمیت کس قدر۔

فریقِ مخالف تو ایک طرف، ان سے خود ان کے رفقاء بھی رہ رہ کر پوچھتے کہ مسلمانوں میں اس وقت اس قدر اختلافات ہیں۔ یہ انہیں مٹا کر کس طرح ایک امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھل جائیں گے؟ اس کے جواب میں انہوں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۴۵ء کو پیغامِ عید کی نشری تقریر میں فرمایا کہ:-

جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکیں گے۔ (تقاریرِ جناح۔ جلد اوّل صفحہ ۱۰۸)

انہوں نے کراچی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۳ء میں اِسی اجمال کی تفصیل بڑے بلیغ انداز میں فرمائی۔ انہوں نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ:۔

> وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس اُمّت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے ......؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب اِن الفاظ میں دیا:۔

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم قرآنِ مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسولؐ، فلہٰذا ایک قوم۔ (تقاریرِ جناحؒ جلد دوم۔ صفحہ ۵۰)

اس سے آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ کے نزدیک بھی نہ صرف یہ کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر غیرمسلموں کے مقابلہ میں ایک جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے تھے، بلکہ خود مسلمانوں کے اندر بھی اتحاد ہی نہیں بلکہ وحدت کا بھی یہی ذریعہ تھا۔ اور یہی اسلام کا بھی مقصود ہے۔ انہوں نے ان تمام حقائق کو ایک مقام پر اس حسن و خوبی سے یکجا کر دیا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اُسے مملکتِ پاکستان کے آئین کی بنیاد کہنا بے جا نہ ہوگا۔ ہوا یہ کہ قائداعظمؒ ۱۷ اگست ۱۹۴۱ء کو حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ وہاں بعض نوجوان طلباء نے ان سے کچھ سوالات کئے۔ اس مکالمہ کو مسٹر محمود علی بی اے (عثمانیہ) نے محفوظ کر لیا۔ اور ینیٹڈ پریس کی وساطت سے یہ اخبارات میں شائع ہوا اور طلوعِ اسلام نے اِسے مارچ ۱۹۴۲ء کے پرچہ میں شائع کیا۔ یہ انٹرویو بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ اِسے بار بار سامنے لایا جائے۔ آپ بھی توجہ سے سنیئے:۔

اِسلامی مملکت کا امتیازِ خصوصی

سوال:۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورہ کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں، نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اِس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی

پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال:۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ اشتراکیت، بالشویت یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسالک دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سارا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال:۔ ترکی حکومت تو ایک مادی حکومت (سیکولر اسٹیٹ) ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب:۔ میرے خیال میں ترکی حکومت پر مادی حکومت کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کے لئے تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

سوال:۔ وہ مملکت ہمیں ہندوستان میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟

جواب:۔ مسلم لیگ، اس کی تنظیم، اس کی جدوجہد، اس کا رُخ، اس کی راہ سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال:۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور رو بہ ترقی لا سکیں، تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کر دے؟

جواب:۔ وقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت، بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصلی

حدود کیا ہیں، اِن امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے، اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی ان کے اپنے سوا کسی اور میں) اِس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی — حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں، ان مولوی صاحبان میں (اِلّا ماشاءاللہ) نہیں پاتا۔ (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

آپ اس مکالمہ کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ قائدِاعظمؒ کے تصور میں اُس پاکستان کا کیا نقشہ تھا، جس کے لئے وہ اِس قدر تن دہی اور جانفشانی سے مصروفِ کار تھے۔ اُسی زمانہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ جب بقول قائدِاعظم، مولوی صاحبان میں نہ اِس کی صلاحیت تھی، نہ اس کی استعداد کہ وہ امورِ مملکت کو سمجھ بھی سکیں تو پھر اُن کے ذہن میں وہ کون سا طریق تھا جس سے وہ اس مملکت کو حقیقی معنوں میں اسلامی بنانا چاہتے تھے۔ اس سوال کا اجمالی جواب تو خود اس انٹرویو کے ایک ایک فقرہ کے اندر موجود ہے۔ یعنی یہ کہ اِس میں قرآن کریم کے احکام ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کریں گے۔ لیکن اس کی تفصیل انہوں نے کئی دیگر مقامات پر بھی بتائی۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام، عید کے پیغام میں اِس کی وضاحت اِن الفاظ میں فرمائی۔

> اِس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام، مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مورخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ بحرِاطلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اِس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سِول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جو نوعِ انسان کے تمام اعمال و احکام کو محیط ہیں اور جو غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اِس کے بعد قائدِاعظمؒ نے کہا:۔

> اِس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا، عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ اِن سب کے لئے اِس میں قوانین

موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔

(تقاریرِ جناحؒ۔ جلد دوم۔ صہ ۳)

تھیاکریسی کے خلاف

اس سے واضح ہے کہ قائدِاعظمؒ کے تصور میں یہی تھا کہ مملکتِ پاکستان کا بنیادی دستور قرآن کریم ہوگا۔ اور ملّتِ پاکستانیہ باہمی مشاورت سے یہ طے کرے گی کہ اس کے اصول و اقدار و احکام کو بحالاتِ موجودہ نافذ کرنے کا کیا طریق ہو۔ اس لئے اُنہوں نے بار بار اس کی وضاحت کر دی کہ یہاں تھیاکریسی قائم نہیں ہوگی۔ چنانچہ اُنہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں بحیثیت گورنر جنرل اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا۔

پاکستان کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار، جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اُسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں، جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ مسلّمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی، جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صہ ۶۵)

مشرقی اور مغربی پاکستان

مجوزہ مملکتِ پاکستان کے خلاف عام طور پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا تھا کہ اس میں ایک مملکت دو ایسے حصوں پر مشتمل ہوگی جن میں قریب ایک ہزار میل کا فاصلہ ہوگا۔ ان میں نظم و ضبط اور رابطہ اور واسطہ کا ذریعہ کونسا ہوگا۔ قائدِاعظمؒ نے ۱۹ر فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈکاسٹ میں پہلے یہ فرمایا۔

مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے قریب ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال اُبھرے گا وہ یہ ہوگا کہ ایسی مملکت کا قیام کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں، جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی؟ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں

دوں گا۔ اور وہ یہ کہ ایسا ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر، ایمان اپنے آپ پر، ایمان اپنے مستقبل پر۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں، وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اِس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔

اِس کے بعد انہوں نے فرمایا:-

پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمدؐ رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اُس اسلامی برادری کے ارکان ہیں، جن میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساسِ دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (ان بنیادوں پر ہم ایک قوم بنتے ہیں۔)

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صفحہ ۵۸)

آپ نے بعض ایسے لوگوں کو جو اپنے دل میں مملکتِ پاکستان اور اس کے معمار، قائدِ اعظمؒ کے خلاف خبثِ باطن رکھتے ہیں، یہ کہتے سنا ہوگا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِ اعظمؒ نے اسلام کا نام محض ایک وکیلانہ حربہ کے طور پر لیا تھا۔ درحقیقت ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گی۔ اُن کے تصور میں اس کا نقشہ ایک سیکولر اسٹیٹ ہی کا تھا۔ آپ سنیئے کہ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد بحیثیت گورنر جنرل اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خالق دینا ہال کراچی میں، حکومتِ پاکستان کے افسروں سے اپنے اوّلیں خطاب میں کیا فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:-

پاکستان کا قیام، جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے، جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں۔ اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رو بہ عمل لائے جا سکیں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۲۲)

یہ تھا عزیزانِ من! وہ حسین خواب، جسے ہم نے غیر منقسم ہندوستان کی شبِ تیرہ و تار میں دیکھا تھا۔ خود قائدِ اعظمؒ نے اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں فرمایا تھا کہ "پاکستان جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین خوابوں کی تعبیر ہے، پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آ گیا۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔"

X

خواب کی تعبیر

یہ تھا ہمارا خواب۔ اب اس خواب کی تعبیر دیکھئے۔ مگر دیکھنے کے لئے آپ کو جگر تھام کر بیٹھنے کی ضرورت ہوگی، اس لئے کہ ؎

ہم اپنی روداد کیا سنائیں، کچھ اِس میں ہیں واقعات ایسے
اگر کوئی دوسرا سناتا، ہمیں سمجھتے اسے فسانہ!

پاکستان کا حسین خواب حریر و اطلس کے دو نرم و نازک دھاگوں سے بُنا گیا تھا۔ ایک یہ کہ مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنیادوں پر غیر مسلموں سے الگ قوم ہیں؛ اور دوسرا یہ کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی، جس کا بنیادی دستور خدا کی عظیم کتاب قرآنِ کریم ہوگا۔ اب یہ دیکھئے کہ ہم نے اِس تانے بانے کے ساتھ کیا کیا اور اس کا نتیجہ کیا نکلا۔

مملکتِ پاکستان کی بنیاد اِس دینی حقیقت پر تھی کہ غیر مسلم اور مسلم مل کر ایک قوم نہیں بن سکتے۔ قائدِ اعظم تشکیلِ پاکستان کے بعد صرف ایک برس تک زندہ رہے، اور وہ بھی صدہا قسم کے مصائب و مشکلات میں گھرے ہوئے اور گوناگوں عوارض کا شکار۔ اُن کی وفات کے بعد دنیا یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ گئی کہ خود حکومتِ پاکستان نے اپنی مملکت کے اِس بنیادی ستون کو اپنے ہاتھوں سے ڈھا دیا۔ وہ اِس طرح کہ انہوں نے اِس مملکت کی حدود کے اندر بسنے والے مسلمان اور غیر مسلموں کو اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم تسلیم کر لیا۔ اس سے اس مملکت نے خود اسلام کے ایک بنیادی اصول سے جس طرح انحراف کیا، اُسے تو چھوڑیئے، دیکھئے یہ کہ اِس سے اس کی سیاست پر کیا اثر پڑا؟ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی کم و بیش ڈیڑھ کروڑ تھی۔ وہ ایک خاص منصوبے کے تحت وہیں رہ گئے، ہندوستان کی طرف منتقل نہیں ہوئے۔ اِس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ انہوں نے وہاں کے مسلمان بنگالیوں کے ذہن میں یہ خیال ابھارنا شروع کر دیا کہ تمہاری آبادی مغربی پاکستان کی آبادی کے مقابلہ میں زیادہ ہے، لہٰذا جمہوریت کی رُو سے مملکتِ پاکستانیہ کی زمامِ اقتدار تمہارے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ اکثریت اور اقلیت کا یہ سوال بجائے خویش نظریۂ پاکستان یا اسلام کے تصور کے خلاف تھا۔ جب (کم از کم) ایک ملک میں رہنے والے تمام مسلمان ایک قوم یعنی امتِ واحدہ ہوں تو ان کے اندر اکثریت اور اقلیت کا سوال کیا! یہ کفریقی لعنت تو مغربی نظامِ جمہوریت کی پیدا کردہ ہے، جس میں قوم سیاسی پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے اور جو پارٹی

کسی طرح عددی اکثریت حاصل کر لے، زمامِ اقتدار اس کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ اور دوسری پارٹیوں کو اس کا حق دے دیا جاتا ہے کہ وہ اِس پارٹی کے خلاف ایجی ٹیشن کرتی رہیں، اور یوں قوم کے انتشار، خلفشار اور فساد کے جراثیم پرورش پاتے رہیں۔ اس مقام پر میں آپ کی توجہ ایک اور دلچسپ حقیقت کی طرف منذول کرانا چاہتا ہوں۔ انگلستان میں جمہوری نظام رائج ہے۔ وہاں اکثریت اور اقلیت کا سوال ایوانِ پارلیمان کے اندر تک محدود ہے۔ ملک میں مذہب کی بنیادوں پر اکثریت اور اقلیت کا کوئی سوال نہیں۔ وہ سب ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ جمہوری نظام، بھارت میں بھی رائج ہے۔ لیکن وہاں ایک اکثریت، اقلیت پارلیمان کے اندر ہے، اور دوسری اکثریت، اقلیتِ عام ملک کے اندر۔ یعنی ہندو اکثریت اور غیر ہندو، (مسلمان، عیسائی وغیرہ) اقلیتیں۔ ہم نے اپنے ہاں نظامِ جمہوریت بھی رائج کیا، تو بھارت کے نمونے کا، جس کی رو سے، ایک اکثریت اور اقلیت، پارلیمان کے اندر ہے۔ دوسری اکثریت۔ اقلیت، بہ بنائے مذہب، ملک کے اندر — اور پھر ان دونوں پر مشتمل پاکستانی قوم — یعنی اس میں دین کے ایک مسلّمہ، اور مطالبۂ پاکستان کی بنیاد سے انحراف تو ایک طرف، خود نظامِ جمہوریت کی بھی نفی ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم سوچنا چھوڑ دے تو اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ بہرحال ہمارے ہاں یہ نظامِ جمہوریت اختیار کر لیا گیا۔ حتیٰ کہ اقامتِ دین کی علمبردار ہونے کی مدعی جماعتوں تک نے اِسے اسلامی قرار دے دیا۔ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے پیشِ نظر مقاصد کے لئے یہ نظام بڑا سازگار تھا۔ اس کے ساتھ ہی اِس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی صرف تعداد ہی اتنی کثیر نہ تھی، وہ وہاں کی مسلمان آبادی کے مقابلہ میں ہر اعتبار سے دستِ غالب کی حیثیت رکھتے اور زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے تھے۔ تجارت، سیاست، اقتصادیات، معاشرت، حتیٰ کہ تعلیم تک کا ہر گوشہ ان کے زیرِ اثر تھا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہاں اسلامیات کے مدرّس بھی ہندو تھے۔! نتیجہ اس کا یہ کہ وہ خطۂ زمین، حصّہ تو مملکتِ پاکستان کا تھا لیکن حکومت وہاں بھارتی ہندوؤں ہی کی تھی۔ مشرقی پاکستان سے نیچے اتر کر قریب قریب یہی پوزیشن سندھ کی تھی، وہاں بھی ہندو بڑی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔

مشرقی پاکستان میں ہندو

انگریز کے زمانے میں سارے ہندوستان کا نظام یک حکومتی تھا۔ جس میں اقتدار کا سرچشمہ مرکزی حکومت تھی۔ انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر ملک کو ضلعوں، کمشنریوں اور صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس وقت صوبوں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ پاکستان میں بدقسمتی سے ایسی فضا پیدا کر دی گئی جس میں مختلف صوبوں نے اپنے آپ کو الگ الگ حکومتیں سمجھنا شروع کر دیا — حکومتیں ہی نہیں بلکہ الگ الگ

صوبائی تفریقات

قومیتیں — اس احساس کے آثار بھی اولاً مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے شروع ہوئے اور اتنی جلدی کہ وہاں زبان کے اختلاف کی آڑ میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں فسادات شروع ہو گئے، اور حالات ایسی نزاکت اختیار کر گئے کہ خود قائداعظمؒ کو وہاں جانا پڑا۔ یہ شروع ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ وہ وہاں قریب نو دن ٹھہرے۔ واپسی پر انہوں نے وہاں کے رہنے والوں کے نام ریڈیو سے ایک الوداعی پیغام نشر کیا، جس کے دوران فرمایا:۔

پاکستان، مسلم قومیت کی وحدت کا مظہر ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ ہمیں حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس وحدت کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے۔ اگر ہم نے اپنے آپ کو اولاً بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ کی حیثیت سے سمجھنا شروع کر دیا، اور مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت محض اتفاقیہ تصور کر لی گئی تو پھر پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ یہ نہ سمجھئے کہ یہ کوئی بعید از قیاس اور ناقابل فہم سا مسئلہ ہے۔ ہمارے دشمنوں کو اس کے امکان کا اچھی طرح اندازہ ہے، اور انہوں نے ابھی سے اس کے لئے بساط بچھانی شروع کر دی ہے۔ میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا سوچیئے کہ جب سیاسی ایجنسیاں اور ہندو پریس، جس نے تشکیلِ پاکستان کی انتہائی مخالفت کی تھی، مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے مزعومہ "منصفانہ حقوق" کا درد دل میں لے کر اٹھیں، تو کیا یہ ایک انتہائی شرانگیز چال نہیں ہو گی۔ کیا اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے نہیں آجاتی کہ یہ عناصر تخلیقِ پاکستان کی مہم میں ناکام رہ گئے تو اب انہوں نے اس کے اندر انتشار پیدا کر کے اسے ختم کرنے کی ٹھان لی ہے اور اس کے لئے ایسا شرانگیز پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے، جس سے ایک مسلمان بھائی دوسرے بھائی کے خلاف لڑنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

پاکستان دشمن عناصر کی اِن شرانگیزانہ سازشوں کا وجود بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمان اِن کا شکار کیوں ہونے لگ گئے؟ اس کا جواب صاف اور واضح ہے۔ ہم ہندوستان سے مسلم قومیت اور پاکستانی آئیڈیالوجی کے نظریات لے کر تو ضرور آئے تھے، لیکن ان کی بنیادوں پر ایک اُمت نہیں بن پائے تھے۔ نہ ہی ہم نے اس کا احساس کیا تھا کہ یہی ہماری مملکت کے ستون اور ہمارے جداگانہ تشخص اور وجود کی وجہِ جواز ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران نہ اتنا وقت تھا، نہ اتنی فرصت کہ ہم ایسا کر سکتے۔ یہاں آنے کے بعد ہم نے اس

کا احساس کیا، قرآنِ کریم کی روشنی اور قوموں کی نفسیات کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر

تعلیمی انقلاب کا تصوّر

پہنچا کہ اس کا علاج، اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے نصاب و نظامِ تعلیم کو یکسر بدل دیں تاکہ ہماری آنے والی نسلوں کی ذہنی اور قلبی تربیت اس انداز کی ہو کہ وہ ان نظریات کی حامل قوم بن کر اُبھرے۔ یہاں جو حضرات برسرِاقتدار تھے، اسے حسنِ اتفاق سمجھیئے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران، ہم قافلہ ہونے کی وجہ سے، اُن میں سے اکثر کے ساتھ میرے مراسم یا کم از کم تعارف تھا۔ اس لئے ان تک مجھے باریابی حاصل تھی۔ میں نے اُن میں سے ایک ایک پر اِس تبدیلی کی اہمیت واضح کی اور اس مقصد کے لئے بلا مزد و معاوضہ اپنی حقیر سی خدمات بھی پیش کر دیں۔ وہ نظری طور پر اس سے اتفاق کرتے رہے، لیکن ہماری بدقسمتی کہ عملاً اُن میں سے کسی نے بھی کچھ نہ کیا۔۔ نتیجہ اُس کا یہ کہ ہماری آنے والی نسل، جسے ہمارے دیکھتے دیکھتے ملّتِ پاکستانیہ بن جانا تھا، بے راہ روی کی اُسی قدیم فضا میں پرورش پاتی رہی۔ جیساکہ میں نے پہلے کہا ہے، مشرقی پاکستان کی نئی نسل کا ملتاً ہندوؤں کی گرفت میں تھی۔ وہاں کا پورا نظامِ تعلیم اُن کے

اس تعلیم کے برگ و بار

ہاتھ میں تھا۔ اس تعلیم نے وہاں کس قسم کے نوجوان پیدا کئے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک اُس خط سے سامنے آ جاتی ہے جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم اے فائنل کے طالب العلم عزیزالرحمٰن نے روزنامہ ——— (DAINIC PAKISTAN) کی ۷ رمئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں شائع کیا تھا.... اس خط کا اُردو ترجمہ حسبِ ذیل ہے:۔

> ۱۹۴۷ء میں، تشکیلِ پاکستان کے ساتھ مغربی پاکستان کی طرف سے جو لہر ہماری طرف آئی تو اس سے ہم نے اپنے بنگالی تشخص کو فراموش کر دیا۔ پنجابیوں، سندھیوں اور بہاریوں کے ساتھ خلا ملا کی وجہ سے ہم اس قدر بے وقوف بن گئے کہ ہم نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ہم اوّلاً مسلمان ہیں اور اس کے بعد بنگالی، بہاری، پنجابی وغیرہ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ سامراج ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ (جس کے نتیجہ میں پاکستان، بھارت سے علیحدہ ہو گیا تھا۔) لیکن آج ہمیں قدرے اطمینان کا سانس لینا چاہیئے کہ مختلف اداروں کی کوشش سے خوابیدہ بنگالیوں میں حرکت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسٰے اور (معاذاللہ) علی حبیبوں کو اپنا ہیرو سمجھنے میں فخر محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ ہم اپنے بچوں کا نام

اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں لکھنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا ــــ اللہ ــــ کو اپنا معبود تصوّر کر لیا تھا۔ ہم نور اللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے تھے اور ناگن اور کھاگن جیسے سیدھے سادھے ناموں کو تیاگ بیٹھے تھے۔ یہ سب ان رنگین چشموں کا نتیجہ ہے جسے باہر سے درآمد کیا گیا ہے۔ ...... لیکن اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔ مشرقی بنگال کی اس روش کے نتیجے میں مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انھوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں، اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔ اگر ہم اسی طریق سے اپنے دیگر اہلِ وطن کے خیالات کو بھی متاثر کرتے رہے کہ وہ جغرافیائی اور لسانی قومیت کو اسلامی قومیت پر ترجیح دیں تو مغرب کی عیسائی قوموں نے ترکوں کی خلافت کو تباہ کر کے جو کچھ حاصل کیا تھا، ہم اس سے بھی زیادہ حاصل کر لیں گے۔

(طلوعِ اسلام۔ بابت اپریل ۱۹۷۱ء بحوالہ)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان میں ہندو مقابلتاً سندھ میں زیادہ اثر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عزیز الرحمٰن نے یہ کہا تھا کہ بنگالیوں کی طرح یہی جذبات سندھیوں میں بھی بیدار ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں کے ان اثرات اور غلط نظامِ تعلیم نے سندھ میں کس قسم کی نئی تعلیم یافتہ نسل کو جنم دیا ہے اس کا اندازہ ایک سندھی طالبہ مس نسیم مغل کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ "حریت" کی ہفتہ وار اشاعت بابت ۴ر نومبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس طالبہ نے لکھا یہ تھا۔

وہ اسلام اور پاکستان، جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے۔ ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجو دارو، کوٹ ڈجی جہان کے آثارِ قدیمہ، اور لطیف، سچل، ایاز، جی۔ ایم۔ سیّد کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے

عظیم ہے۔ (نہ کہ اسلام کی وجہ سے) (طلوع اسلام۔ دسمبر ۱۹۶۸ء)

اور آگے بڑھیے۔ مشرقی پاکستان کے ۱۹۷۱ء کے المیہ کے بعد اور اُس قیامتِ صغریٰ کے پیشِ نظر جو وہاں کے "بہاری" (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر گزری، سندھ کی ایک اور بیٹی ـــــ غزالہ بلوچ ـــــ کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی ۱۹ر اگست ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اُس نے لکھا تھا۔

اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پُرمسرت حالت میں ہوتے، لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان، ایک پاکستان، کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے۔ اور اب اپنی حماقت کی قیمت اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بدقسمتی دراصل اس دن شروع ہوتی ہے جب انہوں نے ۱۹۴۶ء میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو وہ آج بہار میں آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر، ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے، تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں۔ یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں، جس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔ (طلوع اسلام۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء صفحہ ۴۳)

یہ تھا اُس تعلیم و تربیت کا نتیجہ جو ہماری درسگاہوں میں ہماری نئی نسل کو دی جا رہی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، میں اِن تمام مناظر کو اربابِ حل و عقد کی خدمت میں پیش کرتا رہا۔ ان میں سے بعض حضرات کی کشادہ نگہی مجھے نرم گرم باتیں کرنے کی بھی جرأت دلا دیتی تھی۔ میں اُن سے واشگاف الفاظ میں کہتا کہ آپ پاکستان کی بہبود اور ترقی کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں سب بجا اور درست، لیکن آپ یہاں جس قسم کی قوم تیار کر رہے ہیں، اُس کے پیشِ نظر بالفعل مجھے خود پاکستان کا وجود خطرہ میں نظر آتا ہے۔ نہروں، پلوں، سڑکوں، منڈیوں، بینکوں، کارخانوں سے کہیں زیادہ اہمیت ان درسگاہوں کو حاصل ہوتی ہے جن میں نئی قوم زیرِ تعمیر ہوتی ہے۔ ان درسگاہوں میں جس قسم کی نسل پرورش پا رہی ہے، جب

وہ آگے بڑھ کر قوم بن جائے گی تو وہ تباہی مچا دے گی اور یہ ریلیں، سڑکیں، نہریں سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ لیکن اسے انہوں نے ان سنی کر دیا، اور قوم اسی نہج پر تیار ہوتی رہی۔ یہ کچھ تو ہماری نئی نسل کے ساتھ ہو رہا تھا...... جہاں تک ہماری سابقہ نسلوں کے بقیات کا تعلق ہے، جنہیں ہم مسلمانوں کی وہ قوم کہہ سکتے ہیں جو تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں موجود تھی، اِن کے دل میں مذہب کی عقیدت بڑی پختگی سے پیوست ہے۔ اِن کی صورت میں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ مذہب کا صحیح تصور کیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کا جو تصور بنیادی طور پر علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، اور پھر قائداعظمؒ نے اس کا عام چرچا کیا؛ اس کی رُو سے اسلام ایک مذہب نہیں، الدّین ہے جس کے احاطہ میں دنیاوی زندگی کا ہر شعبہ آ جاتا ہے اور اِسی الدّین کو عملاً رائج کرنے کے لئے مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے ہندو نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا۔ اِس خطرہ کی روک تھام کے لئے اس نے سوچا یہ تھا کہ مذہب کا ایک ایسا مفہوم پیش کر دیا جائے جو مسلمانوں کے قدیم مذہب پرست طبقہ کے جذبات کی تسکین کا سامان تو فراہم کر دے، لیکن عملاً وہ ایک مفلوج قوم بن کر رہ جائے۔ اِس ضمن میں، پنڈت جواہر لال نہروؔ نے مشہور برہمو سماجی رہنما، شری کیشپ چندر سین، کی صد سالہ برسی کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

> ہندوستان میں اسلام ایک غلط طریق پر آیا۔ بایں ہمہ اِن ہر دو متضاد تصوراتِ زندگی (اسلام اور ہندومت) میں امتزاج پیدا کرنے کے لئے ایک کو، دوسرے میں جذب کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ گورو نانک اور بھگت کبیر جیسی شخصیتوں اور اکبر جیسے بادشاہ کی کوششوں سے کافی ترقی کر گیا۔ اس کے بعد یہ کوششیں ماند پڑ گئیں لیکن یہ سلسلہ بالکل منقطع نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا، ایک بیرونی طاقت ہندوستان میں آ پہنچی۔ (پمفلٹ معرکۂ دین و وطن از پرویز۔ صفحہ ۱۴)

تصوّف بطور سیاسی حربہ

یہ فروری ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ اسی سال ۲۶ مارچ کو دیوان لال چند نول رائے نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا:-

> تصوف ہی وہ ذریعہ ہے جس کی رو سے امید کی جا سکتی ہے کہ تمام اہلِ ہند قومیتِ واحدہ کے رشتہ میں پروئے جائیں گے اور یہی چیز ہندوستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے صحیح حل کی طرف

رہنمائی کر سکتی ہے۔ (ایضاً)

اسلام کے اس تصوّر (یعنی تصوّف) کے لئے سندھ کی سرزمین بڑی سازگار تھی، کیونکہ وہاں ہندوؤں نے اس سے بہت پہلے اِسے ایک تحریک کی شکل دے رکھی تھی۔ آپ تو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ سندھ کے بڑے بڑے صوفیاء، فقراء اور سرمستوں کے مریدوں میں ہندوؤں کی تعداد بڑی کثیر تھی ــــ اور ان کے مزارات اور خانقاہوں کی تولیت میں ان کا اثر غالب تھا۔ معلوم نہیں، اب وہاں کیا کیفیت ہے، لیکن اسلام کا یہی تصوّر ہے جو وہاں کی فضا پر عام طور پر مسلّط ہے۔ اور جی۔ ایم۔ سید، جو سندھ کی علیحدگی کے جراثیم عام کر رہے ہیں، وہاں اسی اسلام کے احیاء یا فروغ کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انہوں نے آج سے کچھ عرصہ پہلے سندھی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا اُردو ترجمہ "جیسا میں نے دیکھا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اُس میں، پہلے صحیح اسلام کے بنیادی مسلمات کی مخالفت اور تردید کی، بلکہ ان کا مذاق اُڑایا، اور اس کے بعد کہا کہ:-

> صحیح ترین تصوّرِ حیات، تصوف ہے۔ جس کا اہم اصول وحدتِ مذاہب ہے۔ تصوّف، عدم تشدد یا اہمساء کا حامی ہے۔ وہ حق و صداقت پر کسی مخصوص گروہ کی اجارہ داری تصوّر نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی مذہبی، اقتصادی اور سیاسی نظریہ کو حرفِ آخر جان کر اُس کی اندھی تقلید سے گریز کرتا ہے۔
>
> (صفحہ ۲۰۵۔ بحوالہ پمفلٹ معرکۂ دین و وطن۔ صفحہ ۲۲)

مسٹر سیّد نے اُس کتاب کے آخری صفحہ پر لکھا ہے:۔

> صوفی، مذاہب و عقیدہ کی بنیاد پر قومیت استوار کرنے کے خلاف ہے، اور مذاہب کے موجودہ تعصبات کو درست نہیں سمجھتا ــــ وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا حامی ہے۔
>
> (صفحہ ۲۰۷۔ بحوالہ پمفلٹ معرکۂ دین و وطن۔ صفحہ ۲۲)

تشکیلِ پاکستان کے بعد، پاکستان کے بنیادی نظریات کے خلاف یہ جراثیم سندھ کے خطۂ زمین تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ اِسے عام کیا گیا اور بڑی شدّت سے پھیلایا گیا۔ جن حضرات نے تقسیم ہند کا زمانہ دیکھا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ اس وقت پاکستان میں مرجع خلائق، مزارات اور صوفیاء کی درگاہیں موجود تو تھیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی، اور ان کے سلسلہ میں منائی جانے والی تقاریب اور ان میں شمولیت اختیار کرنے والے زائرین اتنے پُرہجوم نہیں ہوتے تھے۔ اس کے بعد آپ دیکھئے کہ اِس اٹھائیس سال کے عرصہ میں یہ

سلسلہ کہاں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ملک کی ساری فضا اس سے معمور ہو چکی ہے۔ کوئی جگہ خالی نہیں جہاں ان مزارات کی نمود نہ کردی گئی ہو، اور سال بھر میں کوئی دن ایسا نہیں آتا جب ان کے سلسلہ میں کوئی نہ کوئی تقریب نہ منائی جاتی ہو ـــــ عرس، میلے، قوالیاں، مشاعرے، مزارات کے غسل اور چادر چڑھانے کی تقاریب، نذر و نیاز کی دیگیں، چڑھاوے۔ قیمتی پتھروں کے فرش، مرصع چھتیں، چاندی اور سونے کے دروازے اور نہ معلوم کیا کیا، جن کا نہ اس سے پہلے کہیں وجود تھا نہ اس قدر نمود ـــــ اب یہ چیزیں یہاں کے عالمگیر مذہب کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت اور بھی قابلِ غور ہے کہ قوم کے نام نہاد ترقی پسند دانشور (یعنی کمیونسٹ) جو خدا اور رسول تک کے منکر اور اسلام کا مضحکہ اڑانے میں پیش پیش ہوتے ہیں، وہ بھی بڑے ذوق و شوق سے ان تقاریب میں شامل ہوتے اور بڑے جوش و خروش سے ان میں حصہ لیتے ہیں۔

کمیونسٹوں یا سوشلسٹوں کی تکنیک یہ ہے کہ معاشرہ کے نوجوان طبقہ میں فحاشی، بداخلاق اور قانون شکنی کے رجحانات عام کرتے جائیں، تاکہ ملک میں ہر طرف خلفشار اور انتشار پھیل جائے۔ دوسری طرف مذہب پرست طبقہ کو ایسے مشاغل میں الجھاتے چلے جائیں، جن سے وہ عالمِ کردار سے یکسر بیگانہ ہو جائیں اور دنیاوی یا سیاسی امور میں دلچسپی لینا ہی چھوڑ دیں۔ چونکہ یہ لوگ کسی اخلاقی قدر کے قائل ہی نہیں ہوتے اس لئے وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر حربہ اختیار کر لیتے اور ہر رنگ کا بہروپ بھر لیتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ یہ لوگ خدا اور رسولؐ کے منکر اور ملحد اور دہریہ ہونے کے باوجود "اہل اللہ" کی مجالس میں شریک ہوتے، صوفیاء کی تقاریب میں بھرپور حصہ لیتے۔ حتیٰ کہ عید میلادالنبیؐ کے سلسلہ میں منعقد شدہ مشاعروں میں نعتیں تک پڑھتے نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر جوش ملیح آبادی کو دیکھئے...... وہ اپنے آپ کو کھلے بندوں خدا کا منکر کہتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے انہوں نے اپنے ماہنامہ "کلیم" کی ایک اشاعت (نومبر ۱۹۳۷ء) میں اپنے عقیدہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ:-

> عظیم الشان پیغمبروں کی (معاذ اللہ ـــــ طلوعِ اسلام) حسرت ناک ناکامیاں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں، اور ہم سے صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ مذہب کا بیان ہے کہ خدا نے انبیاء کے ذریعہ نوعِ انسان کی اصلاح کرنی چاہی تھی، اور اس سلسلہ میں ہزاروں نہیں، لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے تھے۔ مگر

اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اس کا جواب مجھ سے طلب نہ فرمائیے۔ عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر ذرا اندازہ کر لیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم کس راستہ پر گامزن ہے۔

خدا اور اس کے رسولوں کے متعلق یہ خیالات، اور اس کے باوجود، آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ محرم کی مجلسوں میں کس طرح جھوم جھوم کر مرثیے پڑھتے اور "اللھم صل علی محمد و آل محمد" کے نعرے بلند کرتے ہیں۔ اپنے اسی ماہنامہ کی دسمبر ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں انہوں نے مذہب اور وطنیت کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

اپنے آپ کو مسلم یا ہندو، پہلے اور ہندوستانی بعد میں کہنا، جغرافیائی صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے۔ لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے۔ بدن کی جلد کیسی، قومیت تو ہمارا گوشت اور ہمارا خمیر ہے۔ لباس تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت اور وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا، طاقتِ بشری سے باہر ہے۔

مذہب اور قومیت کے متعلق اس عقیدہ کے باوجود یہی شاعرِ انقلاب اُس مملکت کے زیرِ سایۂ عاطفت اُس کے مرکز میں بیٹھے پرورش پا رہے ہیں جو مذہب کے نام پر حاصل کی گئی ہے اور جس کے دستور تک میں یہ شق موجود ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہے۔ ان حضرات کی یہی ٹیکنیک ہے جس کی رو سے کیفیت یہ ہے کہ ایک طرف قوم کو مساواتِ محمدی اور اسلامی سوشلزم کا جھنجھنا دیا جاتا ہے اور دوسری طرف یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ:-

ہم اپنی بقا کی جدوجہد سے آگے بڑھ کر اپنی سربلندی کی جدوجہد کا آغاز کر رہے ہیں، اور یہ آغاز اس لمحہ ہو رہا ہے جب سرزمینِ ایشیا میں ویت نام اور کمبوڈیا کے مجاہدوں نے وقت کے افق کو اپنے خون کی شعاعوں سے سرخ کر دیا ہے۔ جن ازلی دشمنوں سے ہمیں سابقہ ہے ان سے نپٹنے کا راستہ روشن ہو چکا ہے۔ یہ پیام دے رہی ہے مجھے بادِ صبح گاہی کہ اگر پاکستان کو جینا ہے اور سربلند ہو کر جینا ہے تو اسے ایشیا کے افق پر ابھری ہوئی سرخی سے اپنی مانگ بھرنی ہوگی، اور اس سرخی میں اضافہ کرنے کے لئے اپنے لہو میں نہانا ہوگا۔ آزادی اور انصاف کا یہ سورج تاریخ کی تاریکیوں سے ابھر تو آیا ہے، اب اسے جتنی جلدی ہم اپنی روحوں میں اتار لیں، اچھا ہے۔ جتنی جلدی پاکستان میں سوشلزم

آئے گا، اتنا ہی یہ سورج ہماری زمین سے ہم رشتہ ہوگا، اتنی ہی یہ زمین پھول پھل لائے گی۔

یہ اعلان کسی پرائیویٹ شخصیت نے اپنی نجی محفل میں نہیں کیا۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے صاحب نے صوبائی پارلیمان کے اجلاس میں ۷۶-۱۹۷۵ء کا بجٹ پیش کرتے ہوئے بآہنگِ دہل فرمایا۔ (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۵ر جون ۱۹۷۵ء)
اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد قوم کو یہ دھمکی بھی دی کہ:۔

> اگر اب اس سوشلزم کا راستہ روکا گیا، جس کے بارے میں ہم اسلام کے حوالے سے بات کرتے ہیں، تو پھر اس ملک میں کمیونزم آجائے گا۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ ۱۶ر اگست ۱۹۷۵ء)

بات "اسلام کے حوالے" سے کرتے ہیں، اور مانگ ہماری ایشیا سے نمودار ہونے والے سرخ سویرے سے بھرتے ہیں۔! جہاں تک جمہوریت ہماری سیاست" کے منشوری دعویٰ کا تعلق ہے، اس کے متعلق کہا گیا کہ:۔

> جمہوریت ہماری اصل منزل، سوشلزم کے حصول کے لئے پہلے پڑاؤ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوشلزم کے قائد یہ جانتے ہیں کہ سوشلزم کا انقلاب ہمیشہ دو منزلوں میں آیا کرتا ہے۔ پہلا مرحلہ قومی سطح پر جمہوری انقلاب مکمل کرنا ہوتا ہے اور دوسرا مرحلہ سوشلسٹ انقلاب ہے۔ سوشلسٹ انقلاب کبھی پہلے مرحلہ پر نہیں آتا۔ (ایضاً)

اس قسم کے خیالات کے عام کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کا نظریہ جو اسلام ہی کے احیائ کا دوسرا نام تھا، دھواں بن کر اڑ چکا ہے، اگرچہ قوم کو دھوکہ دینے کے لئے نظریۂ پاکستان اور اسلام کے الفاظ بھی برابر دہرائے جاتے ہیں۔

چار قومیتیں

وجودِ پاکستان کی عمارت کا دوسرا ستون یہ تھا کہ مسلم قومیت کی بنیاد دین کی وحدت ہے، وطن کا اشتراک نہیں۔ اور دین کی وحدت کا اوّلین مفہوم یہ ہے کہ مسلمان مختلف قومیتوں میں نہیں بٹ سکتے۔ اس نظریہ کی بنا پر، اور کچھ نہیں تو کم از کم، مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو ایک مستقل قوم قرار دیا جانا ضروری تھا۔ وحدتِ دین کو بھی چھوڑیئے ـــ کم از کم وحدتِ وطنیت کی بنا پر بھی یہاں کے باشندوں کو ایک قوم تسلیم کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن یہاں ایک اور سازش کی گئی۔ مشہور روسی مصنف گانکوسکی نے اپنی تصانیف "تاریخ پاکستان" اور "پاکستان کے عوام" میں اس تصور کو پیش کیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں، متعدد قومیں بستی ہیں۔ اس تصور کو عام کرنے کے لئے ۱۹۷۰ء میں کراچی میں "عوامی ادبی انجمن" کے نام سے ایک تنظیم ظہور

میں آئی۔ اس کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا، جس پر منجملہ دیگر "دانشورانِ قوم" جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں کہا گیا تھا:۔

> ہمارے نزدیک اس جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں، جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں، ان کی زبانیں اور تہذیبیں، کسی ایک قوم کے اثر اور تسلّط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر کر سکیں۔ اس لئے ہم ادیب تمام قوموں کے لئے یکساں داخلی خودمختاری اور ان کی زبانوں کے لئے تعلیم، دفتر اور ملازمتوں کی زبان بننے کا حق چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔ (طلوعِ اسلام۔ مئی ۱۹۷۲ء۔ صفحہ ۲۲)

ان حضرات کی جرأتیں کس قدر بے باک ہو گئی ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اس سے پہلے قائدِاعظمؒ کے یوم پیدائش کی تقریب مختلف تنظیموں کے زیرِاہتمام منائی جاتی تھی۔ اب دو تین سال ادھر سے خود حکومت کے زیرِاہتمام قائدِاعظمؒ کا یوم پیدائش ہی نہیں، پیدائش کا ہفتہ منایا جاتا ہے۔ امسال یہ تقریب ۳، ۴، ۵ جنوری ۱۹۷۵ء کو سیمینار کی شکل میں اسمبلی ہال لاہور میں منائی گئی۔ اس تقریب میں کس کس قسم کے نظریات کی نشر و اشاعت کی گئی اس کی ایک جھلک فیض صاحب کی اس تقریر سے سامنے آ جاتی ہے جو انہوں نے ۴ جنوری ۱۹۷۵ء کے اجلاس میں فرمائی اور جو نوائے وقت لاہور اور پاکستان ٹائمز لاہور کی ۵ جنوری کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انہوں نے "قومی تشخص کی تلاش" کے موضوع پر (بزعم خویش) تحقیق کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے دوران دو قومی نظریہ کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس نظریہ کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ اور اس کے بعد فرمایا:۔

> حصولِ پاکستان کے بعد خود قائدِاعظمؒ کے سامنے بھی دو قومی نظریہ کا تصور باقی نہیں رہا تھا۔ (کتنی بڑی ہے یہ جسارت!.....) لیکن کچھ لوگوں نے اپنے مقاصد کے تحت اس نظریہ کو باقی رکھا۔ بہرحال پاکستانی قوم کا تشخص وہی ہے جو قائدِاعظمؒ نے دیا تھا کہ وہ دھرتی جس کا نام پاکستان ہے، وہاں جو بھی رہتا ہے وہ پاکستانی قوم کا فرد ہے۔ اور یہی دھرتی قومیت ہے۔

یہاں سے کم از کم یہ مترشح ہوتا ہے کہ وطنیت کی بنیادوں ہی پر سہی، فیض صاحب نے مغربی پاکستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم تو تسلیم کر لیا۔ لیکن نہیں! اسی تقریر کے

اگلے چند فقرے بھی سُن لیجئے۔ فرمایا:۔

سرزمین اور فرد کے مرکب کا نام پاکستان ہے۔ اس لئے پہلے تو ہر آدمی کے دل میں اپنے گاؤں اور علاقہ کی محبت پیدا کی جائے۔ لیکن ایک دائرے کے اندر رہ کر ——— اور اس دائرے کے اندر تہذیب و ثقافت اور دوسری علاقائی خصوصیات کو اجاگر کیا جائے۔ اس طرح جو چیز ابھرے گی وہ پاکستان ہوگا۔ (طلوع اسلام۔ فروری ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۷)

آپ نے غور فرمایا کہ مغربی پاکستان میں بھی علاقائی بنیادوں پر مختلف قومیتوں کے تصور کو کس طرح اجاگر کیا جا رہا ہے۔ فیض صاحب اسلام آباد ہی میں فروکش ہیں اور ایسا نظر آتا ہے کہ حکومت کے ذرائع ابلاغ ——— ریڈیو، ٹیلی ویژن اور حکومتی زیرِ اثر پریس ان کی زیرِ ہدایت مختلف قومیتوں کے نظریہ کے عام کرنے میں سرگرم عمل ہے ——— علاقائی زبانوں کا فروغ، لوک گیت، ثقافت کے نام سے علاقائی امتیازات کی عام نمائش، علاقائی میلے ٹھیلے، صوبائی فقیروں کے کلام کی عام نشر و اشاعت۔ اسی نظریہ کے عام کرنے کی مسلسل جدو جہد ہے۔ پریس اس باب میں کیا خدمت انجام دے رہا ہے، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگائیے۔ گذشتہ یوم آزادی کی تقریب پر برسرِ اقتدار پارٹی کے سندھی روزنامہ "ہلالِ پاکستان" نے بھی خاص نمبر نکالا، اس میں ایک طویل مقالہ شائع ہوا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ ایک لادینی ملک چاہتے تھے اور قیام پاکستان کا مطلب نظریاتی مملکت قائم کرنا نہیں بلکہ سیکولر پاکستان تھا۔ اس میں مقالہ نگار نے لکھا کہ:۔

نظریۂ پاکستان کا نعرہ ملک کے دو حصّوں کو جمع نہ رکھ سکتا تھا۔ پھر بھی نظریاتی مملکت کے مطالبات کئے جا رہے ہیں...... نظریۂ پاکستان یا ایک مذہبی مملکت کا نظریہ نہ صرف تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کرتا ہے، بلکہ گھٹیا سوچ بھی پیدا کرتا ہے۔

(بحوالہ هفتہ وار ایشیا لاہور۔ بابت ۳۱ر اگست ۱۹۷۵ء)

مقالہ نگار کا دستِ بے باک، گریبانِ قائدِاعظمؒ تک بھی جا پہنچا۔ اور اس نے لکھا کہ:۔

پاکستان میں اسلامزم والے نظریہ اور نظریاتی ملک کی تردید کتنے ہی مواقع پر قائدِاعظمؒ نے خود کی تھی...... پاکستان کی جد و جہد جیسے جیسے بڑھتی گئی ویسے ویسے قائدِاعظمؒ پاکستان کا صحیح تصوّر پیش کرنے لگے۔ اور سیکولرازم اور لادینیت پر زور دینے لگے۔ (ایضاً)

آپ غور فرمائیے کہ پاکستان میں بیٹھ کر، بانئ پاکستان کے خلاف اس قدر کھلی ہوئی افتراپردازی

اور الزام تراشی کی جرأت، کس قسم کی سازشوں کی غماز ہے ؟

چلتے چلتے ایک اور بات بھی ذہن میں رکھئے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ قائدِاعظم کے یوم پیدائش کی تقریب میں کس قسم کے خیالات پیش کئے جاتے ہیں۔

جشنِ پیدائش قائدِاعظمؒ

اب حکومت نے اعلان کیا ہے کہ ۱۹۷۶ء میں قائدِاعظمؒ کے یوم پیدائش کا صد سالہ جشن منایا جائے گا۔ اور اس سلسلہ میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ اور بانیٔ پاکستان کے سوانح حیات مرتب و مدون کر کے کتابی شکل میں پیش کئے جائیں گے۔ یہ خدمت بھی فیض احمد فیض اور اُن کے اس انداز کے ہم نواؤں کے سپرد کی جا رہی ہے جن کی فکر اور زاویۂ نگاہ کا نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ، آئندہ سال کے مجوزہ جشن کی تقریب پر تحریکِ پاکستان اور حیاتِ قائدِاعظمؒ کو کس رنگ میں پیش کیا جائے گا۔

ڈھاکہ کے طالب علم عزیزالرحمٰن کو اُس خط کو ایک بار پھر سامنے لائیے، جس کا اقتباس پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کے آخر میں اُس نے کہا تھا کہ یہی خیالات اب سندھ میں بھی عام ہو رہے ہیں۔ سندھ میں یہ سازشیں کس طرح روبہ عمل ہیں، ان کی تفصیلات بہت کم سامنے آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو کچھ سامنے آتا ہے اُس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ وہاں کی ہواؤں کا رُخ کس سمت کو ہے۔ اس اجمال کی تفاصیل گذشتہ دو تین برس سے طلوعِ اسلام کی مختلف اشاعتوں میں مسلسل پیش کی جا رہی ہیں۔ یہاں اُن میں سے صرف ایک مثال کا دہرا دینا کافی ہوگا۔ وہاں "جیئے سندھ متحدہ محاذ" کے صدر مسٹر جی ایم سیّد نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو سندھ یونیورسٹی میں "سندھی شام" کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی۔ جس میں انھوں نے اپنے تمام نظریات ایک ایک کر کے پیش کئے تھے۔ مثلاً انھوں نے کہا تھا کہ سندھی قوم پرستی کے بنیادی اجزا حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) سندھ کے جداگانہ ملک ہونے میں یقین رکھنا۔

(۲) پاکستان ایک ملک نہیں بلکہ چار جداگانہ ملکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں یقین رکھنا۔

(۳) سندھی، وطن، زبان، کلچر، تاریخی روایات، سیاسی اور اقتصادی مفاد کی بنیادوں پر جداگانہ قوم ہے۔

(۴) سندھی قوم جداگانہ حیثیت میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

اسلامی آئین اور اسلامی حکومت کے متعلق انہوں نے کہا کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ـــــ "جو

لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ یا تو بیوقوف ہیں یا دھوکہ باز" اس کے بعد انہوں نے کہا کہ سندھیوں کے پاس ہر آنے والی حکومت کی پالیسی کو جانچنے کے لئے کچھ معیار ہونے چاہئیں، جن کے مطابق غلط اور صحیح ہونے کا فیصلہ کیا جاتے۔ میری نظر میں وہ معیار یہ ہیں۔

(۱) نظریۂ پاکستان میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھیوں کو کبھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

(۲) مضبوط مرکز میں اعتماد رکھنے والی حکومت سندھ کی دشمن ہے۔

(۳) اسلامی آئین یا اسلامی حکومت پہ یقین رکھنے والی حکومت سندھ کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔

(۴) سندھیوں کی جداگانہ قوم اور سندھو دیش سے انکار کرنے والی حکومت سندھ دشمن شمار کی جا سکتی ہے۔

(طلوع اسلام ۔ جون ۱۹۷۳ء)

یہ ۱۹۷۳ء کی بات تھی۔ حال ہی میں "جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن" کے صدر مسٹر ضمیر [illegible] کا ایک انٹرویو ہفتہ وار "اداکار" لاہور کی ۳۱ر اگست تا ۶ر ستمبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک سوال کے جواب میں اُس نے کہا کہ:

شیخ مجیب علیحدگی نہیں چاہتا تھا، لیکن اُسے علیحدگی کے لئے مجبور کر دیا گیا۔ اسی طرح اگر ہمیں مجبور کیا گیا تو ہم بھی علیحدہ ہو جائیں گے۔

یہ ہیں وہ ہوائیں جو مغربی پاکستان میں کئی برسوں سے چل رہی ہیں۔ میں نے بلوچستان اور صوبۂ سرحد کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ ان سطور کی تحریر کے وقت ان صوبوں کے رہنماؤں کے خلاف مقدمہ سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت ہے، اس لئے ان کی سرگرمیوں کے متعلق کچھ کہنا قانوناً ممنوع ہے۔

خطۂ پنجاب کی حالت

باقی رہا پنجاب، تو یہاں کے حالات سب سے زیادہ یاس انگیز اور عبرت آموز ہیں۔ یہاں کے پرانے لوگ، جو اس خطۂ زمین کی درخشندہ روایات کے حامل تھے، مسلسل غنڈہ گردی اور قانون شکنی سے اس قدر خائف ہو چکے ہیں کہ وہ ڈرے، سہمے، کونوں کھدروں میں چھپے زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ اور جس کے دن اس طرح سے گزر جائیں ـــ وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھتا ہے، ورنہ یہاں تو کوئی شریف انسان، اپنی کسی متاعِ حیات کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ باقی رہی یہاں کی نئی نسل جو نوجوان طالب علموں پر مشتمل ہے، سو ان میں سے کچھ تو سوشلسٹوں کے زیرِ اثر ہر اخلاقی قدر سے بے باکی میں فخر محسوس کرنے لگ گئے ہیں۔ طالب علموں کا دوسرا گروہ جماعتِ اسلامی کے زیرِ اثر ہے، جس نے انہیں اوروہی جھگڑے پہ لگا دیا ہے۔ ان طالب علموں کا اسلام کے متعلق ذاتی علم کچھ نہیں ہوتا۔

ان کے ذہن میں مودودی صاحب کی شخصیت کو اتنا بڑھا چڑھا کر راسخ کر دیا گیا ہے کہ وہ ان کے ہر قول کو وحیٔ منزل من اللہ کی طرح واجب التسلیم قرار دیتے ہیں ــــ مودودی صاحب کو امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن تیمیہؒ کا ہم پایہ، مزاج شناس رسولؐ، حتیٰ کہ اللہ کا شاہکار بنا دیا گیا ہے۔ اُدھر مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا اسلام، ان کی مصلحتوں کے تابع، جسے وہ حکمتِ عملی کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ انہوں نے ان نوجوانوں کو تعلیم یہ دی ہے کہ جماعت سازی کے سلسلہ میں بڑے بلند آہنگ اور مقدس اصول پیش کرنے چاہئیں۔ لیکن جب ان پر عمل کرنے کا وقت آئے تو انہیں بالائے طاق رکھ کر حکمتِ عملی سے کام لینا چاہیئے ــــ اور قیامت یہ کہ انہیں بتایا یہ گیا ہے کہ (معاذ اللہ) خود رسول اللہ کا بھی یہی مسلک تھا۔

انہیں تعلیم یہ دی گئی ہے کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ایسے مواقع پر جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔

انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اپنے مخالف کو قتل کرنے کے لئے جھوٹ اور فریب سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ (معاذ اللہ) ایسا خود رسول اللہ نے بھی کیا تھا۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ انتخابات میں حصہ لینا قطعاً ناجائز ہے اور دوسرے وقت میں اسے عین مطابق اسلام بتایا جاتا ہے۔

ایک وقت کہا جاتا ہے کہ عورت سیاسی امور میں قطعاً حصہ نہیں لے سکتی، اور دوسرے وقت میں مملکت کے منصب صدارت تک کے لئے عورت کے انتخاب کی پُرزور حمایت کی جاتی ہے۔ ایک وقت کہا جاتا ہے کہ زمین اور دیگر ذرائع پیداوار، یا دولت اور جائداد کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی حدبندی عائد نہیں کی جا سکتی اور دوسرے وقت میں خود ہی ان کی حدبندی کی تجویز کی جاتی ہے۔ ایک وقت کہا جاتا ہے کہ نیشنلائزیشن بدترین نظام ہے جسے ابلیس ایجاد کر سکا ہے اور دوسرے وقت میں اسی کی خود ہی سفارش کی جاتی ہے۔ ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ مجالسِ قانون ساز میں پارٹیاں بنانا قطعاً ممنوع ہے اور دوسرے وقت میں اپنے ارکان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ پارلیمان میں اپنی پارٹی قائم کریں۔ ایک وقت میں کہا جاتا ہے کہ امیر، جماعت کے مشورہ کا پابند نہیں۔ اسے مشورہ کے خلاف "ویٹو" کا حق حاصل ہے۔ اور دوسرے وقت میں صدارتی نظام کی اس بنا پر مخالفت کی جاتی ہے کہ اس میں صدر کو "ویٹو" کا حق حاصل ہوتا ہے جو خلافِ اسلام ہے۔ ایک وقت میں وکالت کے پیشے کو حرام قرار دیا جاتا ہے اور دوسرے وقت میں وکلاء کو امام ابوحنیفہؒ وغیرہ کے منصب کا وارث ٹھہرایا جاتا ہے۔

یہ ہے نمونہ اس تعلیم کا جو ان سادہ لوح نوجوانوں کو دی جاتی ہے۔ آپ خود سے دیکھیں گے

تو آپ کو صاف نظر آ جائے گا کہ اِس میں اور کمیونسٹوں کے مسلک میں کوئی بھی فرق نہیں ہے ___ فرق ہے تو بس اتنا کہ کسی مسلمان کمیونسٹ کے دل میں ممکن ہے کبھی تنہائی میں یہ خیال اُبھر آئے کہ جھوٹ، فریب اور تضاد کی یہ روش صحیح نہیں ہے۔ لیکن جماعتِ اسلامی کے تربیت دادہ نوجوانوں کے دل میں اس قسم کا خیال کبھی نہیں اُبھر سکتا کیونکہ انہیں اس کا یقین دلا دیا گیا ہے کہ یہ سب کچھ (معاذ اللہ) خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق ہے اور اس پر عمل پیرا ہونا ثواب کا موجب۔

عزیزانِ من! آپ خود فرمائیے کہ یہاں کس قسم کی قوم تیار کی جا رہی ہے۔ قوم کے بڑے بوڑھے جن کے دل میں اسلامی اقدار و احکام کی عزت و توقیر تھی، ان میں سے بیشتر دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ اس کے بعد ملتِ پاکستانیہ، تمام تر انہی نوجوانوں پر مشتمل ہو گی، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اس سے آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ مستقبل قریب ہی میں اس ملک کا حشر کیا ہونے والا ہے؛ جیسا کہ میں بار بار اعلان کرتا چلا آ رہا ہوں، میرا تعلق نہ کسی مذہبی فرقہ سے ہے نہ کسی سیاسی پارٹی سے۔ میں نے عملی سیاسیات میں قدم ہی نہیں رکھا۔ میں نے تحریکِ پاکستان کی امکان بھر تائید کی تو اس یقین کی بنیادوں پر کہ اس سے ایک ایسا قطعۂ زمین حاصل ہو جائے گا جس میں قرآنی نظام کے احیاء اور تمکن کا امکان ہو گا۔ یہاں آنے کے بعد میں گذشتہ اٹھائیس سال سے مسلسل اس پکار کو دہرائے جا رہا ہوں تو اس لئے کہ یہ میرے ایمان کا تقاضا ہے۔ میرے پاس وہ ساز و سامان نہیں جس سے میں اِس دینی تقاضہ کو ملک کا عملی دستور اور نظام بنا دوں۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، اُس مقصد کے حصول کے لئے، جس کی خاطر یہ مملکت وجود میں لائی گئی تھی، صرف ایک طریقہ تھا اور وہ یہ کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں کہ قرآنی اقدار کی پابندی ان کی زندگی کا تقاضہ بن جائے۔ ہم نے اس سے تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم اُس مقام پر آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں قوم اپنے مستقبل کی طرف سے قاطبتہً مایوس ہو رہی ہے۔ اس کے مستقبل کے تصور سے لرزاں و ترساں تو ہر قلبِ حساس ہے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ مقامِ تاسف یہ ہے کہ یہ احساس نہ اربابِ سیاست کے ذہنوں میں نظر آتا ہے اور نہ اقامتِ دین کے مدعیوں کے قلب میں ___

___ ان میں سے ___ ہر گرگ سمجھ ہے بَرّۂ معصوم کی تلاش۔

سرسید کے زمانے میں بھی قوم، تباہی کے اسی جہنم کے کنارے پہنچ چکی تھی، لیکن جب اُس محسنِ ملت نے یہ سوچا کہ اس کا علاج تعلیم ہے، اور وہ اس تصور کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے اٹھا تو اُس دور کی غلامی اس کے راستے میں مزاحم نہیں ہوئی۔ لیکن

وائے بر حالِ ما، کہ ہمارے دَورِ آزادی میں اس کا بھی امکان نہیں رہا۔ اسکولوں اور کالجوں کی نیشنلائیزیشن اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی شخص یا ادارہ، صحیح اسلامی تصور کی آزاد درسگاہ قائم کر سکے، جس میں محدود پیمانے پر ہی سہی، اس بلند نصب العین کو نوجوانوں کی زندگی کا نصب العین بنایا جا سکے، جسے قرآن نے متعین کیا تھا اور جس کے حصول کے لئے یہ مملکت وجود میں لائی گئی تھی۔ ایک ایسی درسگاہ کے قیام کی میری اسکیم بھی اسی گرداب میں ہچکولے کھا رہی ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! اس خواب کی تعبیر جسے آج سے پینتالیس سال پہلے، حکیم الامت کی نگۂ جہاں بیں نے دیکھا اور بانیٔ پاکستان کی فراست نے جہانِ نو کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اس خواب اور اس کی تعبیر کی طول و طویل داستان کو اقبالؒ نے ایک مصرعہ میں جس ایجاز و اعجاز سے سمو دیا ہے، یقین مانیئے کہ میں جوں جوں اس پر غور کرتا ہوں، سوچوں کے سمندر میں ڈوب جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اس داستان کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ ——— خوابم زیاد رفتہ و تعبیرم آرزو است۔ میں نے ایک خواب دیکھا تھا جو یکسر بھول گیا۔ لیکن میں ہر ایک سے پوچھتا پھرتا ہوں کہ اس کی تعبیر کیا ہے؟ ایک بھولے ہوئے خواب کی تعبیر کی آرزو، یہ ہے ہمارا حاصلِ حیات!

لیکن مجھے، عزیزانِ من! نہ وہ خواب بھولا ہے، نہ ہی میں اس کی تعبیر کی طرف سے مایوس ہوں۔ امید، نہ تو وقت کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے، نہ ہی اسے پیمانۂ امروز و فردا سے ماپا جاتا ہے۔ یہ تو زندگی کی جوئے رواں کی طرح، جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو دایۂ فطرت نے انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ بند کر دیا ہے، نہ ہی قرآن کی نور افشانیوں کا دَور ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے اگر آج کا انسان اس قندیلِ آسمانی سے اپنی زندگی کے راستوں کو روشن نہیں کرنا چاہتا تو نہ سہی۔ کل کو آنے والے انسان اسے دلیلِ راہ بنائیں گے۔ اس کتابِ عظیم کو قیامت تک محفوظ رکھنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ کسی دَور کا انسان بھی روشنی کی طرف سے مایوس نہ ہونے پائے۔ لہٰذا جب تک قرآن باقی ہے۔ (اور یہ ابد تک باقی رہے گا) اس وقت تک امید باقی ہے۔ کس قدر حسین اور شگفتہ انداز میں کہا گیا ہے بات کہنے والا کہ ؎

از صد سخن پیرم، یک حرف مرا یاد است   عالم نشود ویراں، تا میکدہ آباد است

اور یہی وہ حرفِ دلآویز ہے جسے میں بھی دہراتے چلا جا رہا ہوں ؎

قدم قدم پہ جلاتا ہوں خونِ دل کے چراغ   یہ سوچ کر کوئی پیچھے بھی آ رہا ہوگا

قرآن کریم نے ایمان بالآخرت پر جو اس قدر زور دیا ہے تو اس سے مقصد یہی ہے کہ اگر آج کا دَور تمہارے مقاصد کے لئے سازگار نہیں تو مایوس نہ ہو۔ اپنی نگاہ مستقبل پر رکھو۔ یہی مستقبل پر ایمان ہے، عزیزانِ من! جو مجھے کبھی مایوس نہیں ہونے دیتا ——— لہٰذا ؎ نجوم بجھتے رہیں، تیرگی امنڈتی رہے ——— مگر یقین سحر ہے جنہیں اداس نہیں

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۸)   والسلام